بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یہ ضروری نہیں کہ غلط بات لازمی طور پر ایک غیر مخلص انسان کے مُنہ سے ہی نکلے۔ کئی مرتبہ ایک غیر مخلص شخص صحیح بات کہہ دیتا ہے اور ایک مخلص آدمی جذبات کی رَو میں بہہ کر اپنی زبان سے ایک ایسی بات نکالتا ہے جس کی اُس سے توقع نہیں ہوتی۔ اخلاص اور عدمِ اخلاص کے درمیان خط امتیاز کوئی فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ نیت ہوتی ہے جو اس کا محرِّک بنتی ہے۔

خدا کی عدالت میں ہر فرد کو اس کی جزا اور سزا اُس کی نیت کے اعتبار سے ملے گی مگر اس دنیا میں محض اخلاص کسی فرد کے صحیح اور برحق ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کسی شخص کے صرف نیک نیت ہونے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ ہم اس کی رائے کو بلا چون وچرا قبول کرلیں۔ ہمیں کسی چیز کے ردّ وقبول سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس بات کی اُس میں ترغیب دی جا رہی ہے وہ خدا کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں۔

ہمارے اسلاف واخلاف میں کتنے دردمند لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے ملت کی حالتِ زار دیکھ کر مختلف قسم کے منصوبے تجویز کیے اور بعض کو عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی مگر وہ ساری تدابیر حسن کے پیچھے حسنِ نیت موجود بھی تھا، مبنی برحق نہ تھیں۔ مثال کے طور پر کسی دردمند نے یہ دیکھا کہ غیر مسلم سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں پر سبقت لیے جا رہے ہیں تو اس نے بڑے اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کے اندر انگریزی تعلیم کو رواج

دینے کا پروگرام بنایا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ کسی نے یہ دیکھا کہ مسلمان مالی اعتبار سے ابنائے وطن سے کمزور ہیں تو اس نے مسلمانوں کو بنک کھولنے پر آمادہ کیا۔ کسی نے انشورنس کی بنا ڈالی۔ اس قسم کی مخلصانہ کوششیں مسلمانوں کا ایک دردِ دل رکھنے والا طبقہ عرصۂ دراز سے کر رہا ہے اور اب غیر مسلم اقوام کی ترقی دیکھ کر ان میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے مخلصانہ منصوبے جن کے پیچھے بڑے ہی نیک اور مقدس جذبات کام کرتے ہیں مسلمانوں کی سرزمین میں بارآور نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جو گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔ ان صفحات میں ہم آج اسی موضوع پر چند گذارشات پیش کریں گے۔

ابھی حال ہی میں شام کے ایک دردمند ادیب اور صاحب علم نے بڑے گہرے اصلاح کے گہرے جذبے کے ساتھ ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑی دردمندی کے ساتھ مسلم قوم کی اجتماعی بیماریوں کا منصفانہ جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے ایک ایک لفظ سے مصنف کا خلوص جھلکتا ہے۔ مگر وہ اسی خلوص کو جب غلط جگہ استعمال کرتے ہیں تو اس سے بعض عجیب و غریب قسم کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے اس وقت پوری کتاب کا تجزیہ کرنا تو بڑا مشکل ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف اس کے ایک باب پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے مطالعہ کرنے سے اُس غلط طرزِ فکر کا ادراک ہو سکتا ہے جو قوم کے بعض غم خواروں نے ملّت کی فلاح و بہبود کے پیش نظر اختیار کر رکھا ہے۔

زیر تبصرہ مضمون کا عنوان ہے حق الضیافۃ۔ اس میں فاضل مصنف سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں مہمان نوازی کے کوئی آداب نہیں۔ صبح ہو یا شام ہر وقت

ہو، یا سب وقت ہر وقت مہمان نوازی ہوتی رہتی ہے اور خواہ ہم کتنے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں مہمان کے جذبات و احساسات کا ناجائز پاس کرنا ہمارا ایک قومی شعار سا بن گیا ہے۔ فاضل مصنف نے مہمان نوازی کے بعض ایسے طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں کسی حد تک اصلاح کی گنجائش موجود ہے اور فی الواقع اُن پہلوؤں سے اصلاح ضروری بھی ہے مگر انہوں نے اصلاحِ حال کے لیے جو طرزِ فکر اختیار کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط اور اسلام کے یکسر منافی ہے۔

مہمان نوازی کے حقوق و فرائض کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ یہ بتاتے ہیں کہ دراصل مہمان کی عزت و تکریم کا تصور جو مسلمانوں میں صدیوں سے رائج چلا آ رہا ہے۔ وہ اُس وقت کے معاشی ماحول کا نتیجہ ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ حضور کے عہد میں چونکہ صحرائے عرب میں ہوٹلوں کا رواج نہ تھا اور مسافر لوگوں کے گھروں پر ٹھہرنے کے لیے مجبور تھے اس لیے حضورؐ نے مہمان کی پاسداری کی تاکید فرمائی۔ مگر اب ہوٹلوں کے قیام اور ریستوران کی ترقی کے زمانہ میں مہمان نوازی کی اتنی اہمیت باقی نہیں رہی جتنی کہ اُس وقت تھی۔ لہٰذا اب ہمیں اس کے پورے ڈھانچہ کو بدل دینا چاہیے۔

فاضل مصنف کی مہمان نوازی کے بعض غلط طور طریقوں پر گرفت بھی صحیح سہی لیکن اصلاحِ حال کے لیے جو دلیل پیش کی جا رہی ہے وہ یکسر باطل اور اسلام کے تصورِ اخلاق کے بالکل منافی ہے۔ اُن کے طرزِ استدلال کو اگر صحیح قبول کر لیا جائے تو پھر سارے اسلام کو ہی یا لآخر خیر باد کہنا پڑے گا۔ اگر آج مہمان کی عزت و تکریم کو دورِ نبوی کے مخصوص معاشی حالات کا ہی نتیجہ سمجھ لیا جائے تو اسلام کا کونسا پہلو ایسا رہ جاتا ہے جو زمانے کی دستبُرد سے محفوظ رہے گا، پھر اسلام کے کس جزو کو بقا اور دوام نصیب ہو گا اور قرآن کے

اس دعوے میں کہ وہ قیامت تک کے لیے واضح ہدایت ہے کیا وزن باقی رہ جاتا ہے۔ اگر آج ایک شخص مہمان نوازی میں اس اصول کو تسلیم کر لیتا ہے تو کل دوسرا سُود کو اسی کلیہ کے تحت جائز قرار دے دیگا اور کہے گا کہ یہ سُود کی حُرمت جس کا اتنا غلغلہ بلند کیا جا رہا ہے وہ بھی اُس دَور کے مخصوص معاشی حالات کی وجہ سے ہے اور اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضے اس اصول میں بھی ترمیم و تنسیخ کے متقاضی ہیں۔ اسی طرح پھر سُود سے آگے بڑھ کر رقص و سرود، قمار بازی، شراب خوری اور زنا تک کے جواز کے لیے راہ ہموار ہو سکے گی۔ اگر آج عقل و فکر کا رہوار استدلال کی اس غلط راہ پر چل نکلا تو پھر اسلام کا کوئی قانون اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

اور اس معاملہ میں لطف کی یہ بات ہے کہ عقل کا یہ بدمست رہوار نہ صرف اسلام کی عملی تعلیمات کو روندتا ہوا آگے بڑھے گا بلکہ اس کی ٹھوکروں سے عقائد اور عبادات تک بھی نہ بچ سکیں گی۔ اسی دلیل کی بنا پر ایک آدمی بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ تصورِ توحید جس پر اسلام کو بڑا ناز ہے وہ بھی اُس وقت کے معاشی ماحول کی کرشمہ سازی ہے جس میں حضور سرورِ کائنات نے آنکھیں کھولیں۔ حضورؐ کا تعلق چونکہ ایک ایسی سرزمین سے ہے جس میں دُور دُور تک صحرا پھیلے ہوتے ہیں اسی لیے اُن کے اندر ایک خدا کا احساس بیدار ہوا۔ اسی طرح جنّت کی آسائشیں اور دوزخ کی کلفتیں جو ایک مسلم کے فکر و عمل کے بہت قوی محرکات ہیں وہ بھی عرب کے مخصوص جغرافیائی حالات کا پرتو ہیں۔ عرب میں پانی کی چونکہ قلّت ہے اس لیے جنّت کا جو تصور انہیں دیا گیا ہے اس میں نہریں اور میوہ جات بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ "مخصوص حالات" کو اگر استدلال کی بنیاد بنا دیا جائے تو پھر معاملہ کہاں جا پہنچتا ہے اور اس سے کس قسم کے غلط نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

اس طرزِ استدلال کے حاملین کی بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ لوگ فلاح و کامرانی کے سارے معیارات مغرب سے مستعار لیتے ہیں اور پھر انہی کے مطابق امّت کی اصلاح حال کرنے کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں۔ اسلام چونکہ اُن کے دل پسند معیارات کا ساتھ نہیں دیتا اور اُن کی راہ میں قدم قدم پر مزاحم ہوتا ہے اس لیے وہ اسے راستے سے ہٹانے کے لیے بڑے ادب سے اُس کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ تم بڑے مقدس اور واجب الاحترام سہی مگر چونکہ تمہارا تعلق ایک مخصوص عہد سے ہے اس لیے تم اُسی میں صحیح اور برحق تھے اور اس دَور کے لوگوں کے لیے تم نے رشد و ہدایت کا فرض بھی فی الواقع بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا مگر اب جبکہ رہوارِ زمانہ نے تمھیں گرد کی طرح بہت پیچھے پھینک دیا ہے اس لیے اب تمھیں ماضی کی ایک مقدس یادگار سمجھتے ہوئے تمہارے حضورؐ میں سرِنیاز تو خم کرسکتے ہیں مگر تمہیں عملی زندگی میں راہنما نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ تم میں اب وقت کے تقاضوں سے پوری طرح نمٹنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

یہ ہے متجددین کا وہ عام احساس جو کسی نہ کسی طرح اُن کی پوری احتیاط کے باوجود اُن کی تحریروں اور تقریروں میں وقتاً فوقتاً منعکس ہوتا رہتا ہے۔ جو لوگ ذرا جرأت مند اور صاف گو ہیں وہ اسے کھل کر کہتے ہیں کہ "زمانہ نے جو چولی اُتار کر پھینک دی ہے، انسانیت نے جن جنگلوں کو خیرباد کہا ہے اُن کی طرف بلانے والوں کی آواز وحشت اور دیوانگی کی آواز ہے"۔ اور جو ذرا کمزور اور مصلحت بین ہیں وہ اسی بات کو بدلے ہوئے تقاضوں اور حالات کی مجبوریوں کا نام لے کر بیان کرتے ہیں مگر ان سب کا احساس ایک ہی ہے کہ اسلام دورِ جدید میں انسانیت کی رہنمائی نہیں کرسکتا اور اگر اسے رہنما تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تو پھر اس میں حالات کے تحت اتنا تغیّر و تبدّل ضروری ہے کہ اسلام اور مغربی فکر و عمل میں بغیر نام کے کوئی امتیاز باقی نہ رہے، اور اس طرح یہ دین مغربی معیارات پر

پُورا اُتر سکے۔

جس احساس کو عام طور پر" زمانے کے تقاضے" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے وہ دراصل زمانے کے تقاضے نہیں بلکہ مغربی اقدار کے تقاضے ہیں۔ جنہیں ان متجددین کی ذہنی مرعوبیت نے زمانے کے ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ زمانہ دراصل مغرب ہی ہے اور جو کچھ وہاں اس وقت موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے اور فطرت کے عین مطابق۔ اس لیے ہمارے اپنے ملک اور قوم میں اگر کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کی نظیر وہاں نہیں ملتی تو وہ بوسیدہ اور ناکارہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی نظریہ یا عمل کو قبولِ عام ہے اور ہمارے ہاں وہ ناپید ہے تو ہمیں اسے فوراً رواج دینا چاہیے کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر ہم زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں گے اور زمانہ ہم سے ہماری رجعت پسندی کی بنا پر سخت انتقام لے گا۔

یہ بنیاد جس پر ہمارے متجددین کے فکر و عمل کی ساری عمارت تعمیر ہوئی ہے بہی غلط اور کمزور ہے۔ مغربی اقدار کو زمانے کے تقاضے نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی مغربی تہذیب کے استیلاء کو فطری مجبوریوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مغربی تمدن کوئی معیارِ حق و باطل نہیں جس کے مطابق ہم اپنے افکار و اعمال کو پرکھنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک باطل تہذیب کی عملداری اور غلط رجحانات کا دھارا ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظری سے زمانے کے تقاضے یا عصری مطالبات سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک ہمارے فکر کی بنیادی خامی ہے۔

ہم جب بھی اپنے معائب کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو مغرب کی عینک لگا کر ساری صورتِ حال پر نگاہ ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عیوب اور

کمزوریوں کو اچھی طرح دیکھ نہیں پاتے ۔ ہماری تنقید کا ہدف ہر پھر کر وہی موضوعات بنتے ہیں جو مغرب کی نظر میں قابلِ اعتراض ہیں اور جن میں اہلِ مغرب ترمیم اور تصحیح چاہتے ہیں ۔ چنانچہ ہم اپنے پورے معاشرتی، سیاسی، سماجی نظام اور روحانی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور اُن پہلوؤں میں تغیرات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اُن حصوں کو صحیح سمجھ کر جوں کا توں رہنے دیتے ہیں جو سرتا پا غلط ہیں اور جن کے وجود سے ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے ۔ یہ اسی بنیادی نقطۂ نظر کے تغیر کا اعجاز ہے کہ آج اس ملت میں رقص و سرود، قمار بازی اور زنا کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو کسی تشویش کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا ہے بلکہ اس کی باقاعدہ پشت پناہی ہو رہی ہے اور اگر کسی چیز سے ہم پریشان نظر آتے ہیں تو وہ عفت و عصمت کا وہ مضبوط نظام ہے جو ہمارے اخلاق کے لیے حصار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ ہے وہ غلط نقطۂ نظر جس نے ذم کو مدح، معائب کو محاسن اور مثالب کو مناقب میں بدل دیا ہے ۔ اور ہم خواہ مخواہ احساسِ کہتری میں مبتلا ہو کر صحیح تصورات کو بھی باطل ٹھہرا رہے ہیں ۔

مثال کے طور پر اسی مہمان نوازی کو ہی لیجیے ہم نے اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے مغرب کی تقلید میں یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ فعل اپنے اندر صرف معاشی پہلو رکھتا ہے اور اس میں کوئی روحانی یا اخلاقی عُنصر شامل نہیں ۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفاء کے عہد میں چونکہ ہوٹلوں اور ریستورانوں کا رواج نہ تھا اس لیے مسلمانوں کو مہمانوں کی تعظیم و تکریم کی ہدایت فرمائی گئی ۔ اب چونکہ ٹھہرنے کے لیے جگہ جگہ ہوٹل موجود ہیں اس لیے مہمان نوازی کا یہ تصور تبدیلی چاہتا ہے ۔ مہمان نوازی کے بارے میں یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے ۔ مہمان کی عزت و توقیر اور اس کی خدمت ایک معاشی ضرورت نہیں بلکہ ایک اخلاقی تقاضا ہے، اس میں معاشیات کا کوئی عنصر شامل نہیں بلکہ یہ سراسر ایک روحانی اور دینی فریضہ ہے ۔ یہ مسئلہ جیب اور پیٹ کا

نہیں بلکہ اخلاق اور روحانیت کا ہے۔ مہمان اور میزبان کا تعلق کوئی معاشی تعلق نہیں بلکہ ایک خالص انسانی تعلق ہے۔ اس سے انسانوں کے درمیان محبت اور اخوت بڑھتی ہے احساسِ یگانگت ترقی پاتا ہے اور امّت کے مختلف طبقات کے درمیان جو بُعد اور دُوری ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر چند لقموں کا یہ "زیاں" اور تھوڑے سے آرام و آسائش کی یہ "قربانی" انسان کے اندر بعض ایسی صفات کی پرورش کرتی ہے جو انسانیت کا بیش قیمت ورثہ ہیں۔ اس سے انسان کے اندر ہمدردی اور تعاون کے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ ایثار، سیر چشمی اور فراخ دلی جیسی بنیادی انسانی صفات ترقی کرتی ہیں۔ انسانوں کے اندر بے غرضی اور بے نفسی پیدا کرنے کا یہ ایک عملی پروگرام ہے اس لیے اسے محض ایک معاشی ضرورت سمجھ لینا اور پھر اس کے مطابق اصلاحِ حال کے لیے تجاویز پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے اور اس سے امتِ مُسلمہ کو دینی اور روحانی اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

مغرب کا یہ معاشی معیار ہم پر اتنا غالب ہو چکا ہے کہ اب ہم نے اولاد جیسی مقدس اور قیمتی متاع کو بھی زر و مال کے پیمانے سے ماپنا شروع کر دیا ہے۔ اولاد اب ایک بوجھ ہے جس کی کثرت ہمارے لیے تباہی اور بربادی کا پیغام ہے اور اس کی قلت ہمارے حق میں نافع اور سکون بخش ہے۔ غور کیجیے کہ اولاد کے بارے میں ہم نے جو یہ حکم لگایا ہے اس میں سوائے معاشی محرکات کے کوئی اور محرک بھی کارفرما ہے۔ ذی روح انسانوں کو بے جان سکوں کے عوض تولنے کا یہ طریق کار ہم نے مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب سے مستعار لیا ہے اور پھر اسے ہم فلاحِ امت کے نام سے اپنے ہاں رواج دینے کے آرزومند ہیں۔ اگر اولاد ایک خالص معاشی مسئلہ ہو تو پھر یہ تجزیہ بالکل صحیح اور درست ہے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس مسئلہ کو بھی مہمان نوازی کی طرح صرف ایک معاشی مسئلہ سمجھ کر اسے جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ یہ مسئلہ معاشی سے کہیں زیادہ انسانی اور

اخلاقی ہے۔ ماں باپ اس "معاشی بوجھ" کو اگر یہ فی الواقع بوجھ ہی ہے، بڑی خندہ پیشانی سے اٹھانے پر آمادہ ہوتے ہیں بلکہ بعض "خوش نصیب" جن پر یہ بوجھ قدرت لادنا پسند نہیں کرتی وہ اپنی اس "خوش بختی" کو اپنی سب سے بڑی سیاہ بختی خیال کرتے ہیں اور عمر بھر اس بات کی تمنا کرتے ہیں کہ کاش اُن کی پُشت بھی اس کی زیر بار ہو۔ اس بوجھ کے اٹھانے سے ایک انسان کو جو روحانی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن کا اندازہ کوئی معاشی پیمانہ نہیں کر سکتا۔ اُن کی صحیح قدر و قیمت وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے زر و مال کی تنگ حدود سے نکل کر انسانیت اور اخلاق کے نقطۂ نظر سے اِن فوائد کا جائزہ لیا ہے۔ اولاد کی محبت انسان کے لطیف جذبات کی نہایت احسن طریق سے پرورش کرتی ہے۔ انسان کے اندر دوسروں کے دکھ درد کی خاطر اپنے آرام اور چین کو قربان کرنے کا احساس بیدار کرتی ہے

یہی اولاد کی محبت میاں بیوی کے تعلقات میں استحکام کا ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھائیوں اور بھائیوں کے درمیان اور بہنوں اور بھائیوں کے درمیان ایک ہی خاندان کی آغوش میں رہنے کی وجہ سے ایسے لطیف احساسات جنم لیتے ہیں جن کی قدر و اہمیت کو دنیاوی مال و متاع کی میزان میں کبھی نہیں تولا جا سکتا۔ معاشی عُنصر ایک اولاد کے معاملے میں اگر کچھ وزن رکھتا بھی ہے تو وہ بہت کم ہے۔ اس میں جو دوسرے عناصر شامل ہیں وہ اس ایک عنصر پر بہت زیادہ بھاری ہیں۔ مگر ہم نے مغرب کی پیروی میں اسی ایک معاشی پہلو کو دوسرے سارے پہلوؤں پر غالب کر دیا ہے۔

فکر و نظر کا یہ تغیّر اب ہم سے نہ صرف اس بات کا طالب ہے کہ ہم دورِ جدید میں اپنے سارے مسائل مغربی نقطۂ نظر سے حل کریں بلکہ یہ ہم سے اب اس بات کا بھی تقاضا کر رہا ہے کہ ہم اپنے ماضی سے جو تعلقِ خاطر رکھتے ہیں اُس میں بھی مغربی ذوق کے مطابق مناسب تبدیلیاں کرلیں۔ آئیڈیل کی اسی تبدیلی کی وجہ سے اب ہم نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر اصحاب کے بارے میں عجیب وغریب تصورات پیش کرنے لگے ہیں۔ حضور سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ جو ہمارے لیے ایک مثال کی سی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قیامت تک ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے اسے ہم صرف ایک "نامہ بر" کی حیثیت دے رہے ہیں۔ حضورؐ کے اعمال، حضورؐ کے فیصلے اور حضورؐ کے احکام اب ہمارے لیے محض "قصّہ پارینہ" ہیں۔ وہ ہمارے لیے حجت نہیں رہے۔ مغربی افکار سے مغلوب عقلیں اب یہ باور نہیں کر سکتیں کہ کسی ایک فرد کی زندگی اتنی صحیح اور مثالی ہو کہ وہ قیامت تک کے لیے انسانیت کی ہدایت کا سامان فراہم کرے۔ جس طرح مغربی سائنس اور فلسفہ سیمابی مزاج رکھتے ہیں اور زمانے کی ہر رو ان کے اندر تغیّر و تبدّل پیدا کر دیتی ہے اسی طرح ہم اسلامی تعلیمات کو بھی حالات و واقعات کے تابع سمجھتے ہیں اور یورپین نظریات کی پیروی میں یہ برملا کہنے لگے ہیں کہ حضورؐ کے ارشادات زمان و مکان کے پابند ہیں۔ اور زمانہ کے نئے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے سے یکسر قاصر ہیں۔ وہ اپنے دور میں صحیح اور مثالی تھے اور ان کی پیروی اُن لوگوں پر فرض تھی جو آپ کے عہد میں زندہ رہے لیکن آج جب زمانے نے بہت سی نئی کروٹیں لی ہیں اور بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں وہ ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے۔

مغربی فکر و نظر کے مطالبات جنہیں ہم نے غلط فہمی سے عصری تقاضوں کے ہم معنی سمجھ رکھا ہے، اب اتنے بڑھتے جا رہے ہیں کہ ہماری زندگی کا کوئی گوشہ اور ہمارے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اُن کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ یہ اب نہ صرف ہمارے موجودہ مسائل کو ایک خاص نہج سے حل کرنے کا تقاضا کرتے ہیں بلکہ اس بات کے بھی طالب ہیں کہ ہم اپنے ماضی اور اُس کے سارے واقعات کو بھی مغربی ذوق کے مطابق مرتب کریں تاکہ نہ صرف ہمارا حال مغربی تہذیب سے ہم آہنگ نظر آئے، بلکہ ہمارا ماضی بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا

دکھائی دے اور جب ہم تاریخ کے چلمن میں سے جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے تاریخی پس منظر میں بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو مغربی نقطۂ نظر سے کچھ بھی مغائرت رکھے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ماضی کے لٹریچر پر نظرِ ثانی کا مطالبہ جس کو چند سالوں سے بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھایا جارہا ہے اُس کا محرک بھی سوائے مغربی ذوق کے اور کوئی چیز نہیں۔ ماہ دسمبر میں انجمن حمایتِ اسلام کے زیرِ اہتمام جو جلسہ ہوا اور جس میں حضور سرورِ کائنات کی سیرت کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ بھی اسی اندازِ فکر کی غمازی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں جو روئیداد اخبارات میں شائع ہوئی اسے ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اس تجویز کے پیچھے کونسے جذبات کام کر رہے ہیں۔ یہاں ہم اس تجویز کے متعلقہ حصے نقل کرتے ہیں :

> مولانا غلام مرشد نے علمائے اسلام کی اس فروگزاشت پر کڑی نکتہ چینی کی کہ بعض ضعیف روایات ہمارے اسلامی لٹریچر میں اب بھی موجود ہیں جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے حتیٰ کہ حضورؐ پاک کی ازواجِ مطہراتؓ پر نمایاں حملوں کا مواد ہماری کتب سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس بے ادبی کا باعث اور بدطینت نقادوں کے ماخذ کو حذف کرنا حضور نبی کریمؐ سے محبت کا تقاضا اور اُن کی غلامی کا اوّلین مطالبہ ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ رسولِ پاکؐ کی تکریم کے لیے ان روایات کو مسترد کر دینا چاہیے جو کسی بھی طرح حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو مسخ صورت میں پیش کرتی ہیں۔" (بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۰ء)

خود اس مطالبہ اور اس مطالبہ کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی لٹریچر کی "تطہیر" کی یہ ضرورت ہماری ذاتی ضرورت نہیں بلکہ ہم یہ غرض صرف اس لیے سرانجام دینا چاہتے ہیں تاکہ بدطینت مستشرقین اور اُن کے اندھے مقلدین کو مطمئن کیا جاسکے ورنہ یہ روایات جنہیں آج عجمی سازش کہہ کر دریا برد کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے وہ صدیوں سے ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں اور ہمارے

اسلاف نے آج سے بہت عرصہ پیشتر بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ غلط اور صحیح کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔

ہم اس معاملہ میں اس بات کے دعویدار نہیں کہ ماضی میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُس کا ہر حرف مبرا عن الخطا ہے اور اس پر کوئی تنقیدی نگاہ ڈالی نہیں جا سکتی بلکہ اس سلسلہ میں ہماری گذارش صرف اسی قدر ہے کہ آپ بیشک اپنے لٹریچر کا تنقیدی جائزہ لیں مگر یہ کام سرانجام دیتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ آپ کہیں مغربی فکر و نظر سے تو مرعوب نہیں او[illegible] تو آپ کو اس کام پر آمادہ نہیں کر رہا۔ ہمارے اسلاف نے بھی یہی خدمت بڑے احسن طریق سے سرانجام دی ہے اور جو چیز اُن کے سامنے آئی اُسے احتیاط کی ہزاروں چھلنیوں میں سے چھان کر قبول کیا مگر اُن کے ردّ و قبول کا معیار وہ تھا جو انہیں قرآن و سنت سے ملا تھا وہ اُس دور کے غیر اسلامی افکار و نظریات سے متاثر نہ تھے۔ اس حقیقت کو آپ ایک مثال سے سمجھیے۔ حضرت انسؓ سے ایک حدیث مروی ہے۔

حُبّب الی من الدنیا النساء والطّیب وجعلت قُرّۃ عینی فی الصلوٰۃ	دُنیا کی چیزوں میں سے میرے لیے عورتیں اور خوشبو پسندیدہ ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اب اسی حدیث پر مستشرقین اور ائمہ سلف دونوں نے تنقید کی ہے۔ مستشرقین نے اسی روایت کا سہارا لیکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ہوس کار اور بندۂ نفس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو یہ باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے کہ وہ انسان جسے عورتوں اور خوشبو سے محبت ہو وہ روحانی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔

ائمہ سلف نے بھی اس حدیث کا تنقیدی جائزہ لیا ہے مگر اُن کی بحث کا انداز بالکل

جدا گانہ ہے ۔ انہیں اس حدیث میں حضورؐ کی بے ادبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ اُن کی ساری کاوشیں عرف اس ایک نقطہ کو معلوم کرنے تک محدود رہیں کہ کیا یہ واقعی فرمانِ رسول ہی ہے ۔ اس لیے انہوں نے سب سے پہلے اس حدیث کے روایت کرنے والوں کی سیرت و کردار کو پرکھا اور اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کی کہ رواۃ کے ان مختلف سلسلوں میں کہاں کہاں سقم موجود ہے ۔ انہوں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد اس امر کا فیصلہ کیا کہ رواۃ کے اُس سلسلہ کے اعتبار سے جس میں ثابت ، انس ، اور خالد ابن حماد بن زید (خدا ان سب کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے ، شامل ہیں) یہ حدیث مرسل ہے اور ایک دوسرے سلسلہ کے مطابق جو یوسف ، ابن عطیہ ، اور ثابت کے باہمی ربط سے قائم ہوتا ہے یہ موصول ہے ۔ پھر حافظ ابن حجر نے اپنی فاضلانہ تصنیف التلخیص میں رواۃ کے ان مختلف سلسلوں پر پوری طرح بحث کرکے یہ بتایا کہ حدیث "حسن" ہے ۔

اسی طرح اس کے متن کی بھی اچھی طرح جانچ پڑتال کی گئی اور ائمہ فن نے بڑے زوردار الفاظ میں اس حقیقت کو ثابت کیا کہ اس حدیث کے پہلے حصے میں تین کا لفظ اگر کہیں شامل ہے تو وہ زائد ہے کیونکہ اس لفظ کا اضافہ اس کے معنی کو مجروح کر دیتا ہے ۔ یہ تنقید اتنی بے لاگ ہے کہ اس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صالح اور متقی بزرگ کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا اور اس معاملے میں اُن سے جو فروگذاشت ہوئی ہے اُس کی طرف بھی نہایت واضح الفاظ میں بغیر کسی رعایت کے اشارہ کر دیا گیا ہے ۔ پھر حافظ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس راستے کی بنیاد بھی بتائی ہے ۔ اور کہا ہے کہ تین کا لفظ اس حدیث میں اس لیے صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔ کیونکہ نماز سے حضورؐ نے آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے ، اس کا شمار دنیا کی پسندیدہ چیزوں میں نہیں کیا جا سکتا ۔

"تنقیدی جائزوں" کے ان دو مختلف نمونوں میں ہر ذہین آدمی نقطۂ نظر کے اُس

اختلاف کو بادنیٰ تامّل سمجھ سکتا ہے جو ان دونوں گروہوں کے مابین پایا جاتا ہے پہلے گروہ کے نزدیک جو ذہناً بیمار ہے یہ حدیث معاذ اللہ سرور کائنات کی ہوس کاری پر دلالت کرتی ہے اور دوسرے کے نزدیک اس سے حضورؐ کی زندگی کے بعض اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے "عاشقانِ رسولؐ" کے جب روایات پر تبصرے دیکھنے میں آتے ہیں تو میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا ان روایات کے جمع کرنے والوں میں کوئی بھی محبِّ رسول نہ تھا۔ وہ معاذ اللہ سب کے سب رسولؐ اللہ کے دشمن ہی تھے۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں؟ نیک اور خدا ترس لوگوں کے اس ہجوم میں کسی کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہوا کہ اس حدیث سے حضورؐ کے استخفاف کا پہلو نکلتا ہے؟ اور اگر اس چیز کو کسی نے محسوس کیا تو وہ دورِ جدید کے مغرب پرست ہیں؟ کیا حضورؐ کے صحابہؓ میں سے کوئی بھی حضورؐ کا خیر خواہ نہ تھا جو حضورؐ کے ازدواجی تعلقات کی صحیح تصویر پیش کرتا یا کم از کم انہیں اخفا میں رکھتا؟ پھر امام بخاری، مسلم، ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور اسی طرح کے بے شمار ائمہ حدیث میں کسی ایک کو بھی یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ اس نوعیت کی احادیث کو اپنے اپنے مجموعوں میں سے خارج کر کے حضورؐ کی عزت کو بچا لیتے؟ آخر حافظ ابن حجر، دارقطنی اور امام نووی کو کیا ہوا کہ انہوں نے سند کے ہر سلسلے پر کڑی سے کڑی تنقید کی، ہر راوی کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر بڑی احتیاط سے پرکھا اور حدیث کے ایک ایک حرف پر ہر پہلو سے غور کیا مگر ان ساری احادیث کو جن سے حضورؐ کا استخفاف ہوتا ہے انہوں نے بلا چون و چرا قبول کر لیا؟ کیا امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کو بھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ ان عجمی سازشوں کا جن سے حضور سرورِ دو عالم کی عزت پر حرف آتا ہے، پردہ چاک کیا جاتے اور اس طرح حضورؐ کی عفت و عصمت کی حفاظت اور پاسبانی کی جاتی؟ آخر ان روایات کے متعلق یہ احساس مغربی استیلاء کے بعد ہی کیوں غیر معمولی خلش پیدا کر رہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ائمہ سلف کے قلوب چونکہ ہر لحاظ سے صحت مند تھے اس لیے انہیں

حضورؐ کی ازدواجی زندگی کے کسی پہلو میں کوئی سقم نظر نہ آتا تھا۔ وہ اسے بھی حضورؐ سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ کے باقی گوشوں کی طرح ہر اعتبار سے پاک اور منزہ سمجھتے تھے۔ اُن کا ذہن بیمار نہ تھا کہ وہ اس میں کیڑے نکال لیتے اس لیے انہوں نے ان روایات میں استخفاف کا کوئی پہلو نہ دیکھا۔ یہ استخفاف کا احساس بذاتِ خود ایک غلط نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ اور فکر و نظر کے اسی اختلاف میں ایک انسان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ حضور سرورِ دو عالم کو جب معراج ہوا اور آپ نے ان مشاہدات کا تذکرہ مختلف لوگوں سے کیا، تو جو لوگ ذہنی لحاظ سے علیل تھے انہوں نے اس واقعہ کو "دروغ گوئی" سمجھ کر حضور کا مذاق اڑانا چاہا لیکن جن لوگوں کے دل و دماغ ایمان کے نور سے منور تھے، جنہیں خدا پر پورا پورا یقین تھا، جو حضورؐ کی صداقت کے پوری طرح قائل تھے اور حضورؐ کی سیرت پر کامل بھروسہ رکھتے تھے انہیں اس غیر معمولی واقعہ میں کوئی خلافِ عقل بات نظر نہ آئی۔ وہ حضورؐ کو ان رفعتوں کا ہر لحاظ سے مستحق سمجھتے تھے اس لیے یہی ایک واقعہ اگر کج فہم ابو جہل اور اُس کے بدطینت ساتھیوں کے لیے مذاق کا موضوع تھا تو دوسری طرف سلیم الفطرت ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے مقدس رفقاء کار کے لیے یہ ایمان کے بڑھانے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا۔ قرآن مجید نے فکر و نظر کی اسی صحت کو ایک دوسرے انداز سے واضح فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۔ (البقرہ)	ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے، جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انہیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں

سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو

راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔

آخر میں ہم یہ گزارش کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر محض مستشرقین کے اعتراضات کی وجہ سے نظرِ ثانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو پھر قرآن مجید کی بھی خیر نہیں۔ کیونکہ مستشرقین نے قرآن مجید پر بھی بیشمار اعتراضات کیے ہیں۔ نزولِ قرآن، اس کی ترتیب، اسلوبِ بیان اور اس کی تعلیمات میں سے کونسی ایسی چیز ہے جو ان کی زد سے محفوظ رہی ہے۔ اور جس نوعیت کے اعتراضات سے گھبرا کر آپ روایات میں کتر بیونت کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کر رہے ہیں بالکل اُسی نوعیت کے اعتراضات قرآن پر بھی کیے گئے ہیں۔ تو کیا پھر قرآن پاک میں بھی اُن کے ذوق کی رعایت سے ترمیم و تنسیخ کرنا گوارا کریں گے تاکہ انہیں خاموش کیا جا سکے؟ ہم اس طرزِ عمل کے نتائج سے پوری طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر اس ذہنی پسپائی کو ایک مرتبہ قبول کر لیا گیا تو پھر ہمارے پاس کوئی بھی جائے قرار باقی نہیں رہے گی کیونکہ قرآن مجید کا کوئی حصہ ان مستشرقین کی گرفت سے بچ نہیں سکا۔ ان صفحات میں نہ تو اتنی گنجائش ہے کہ ان کے اعتراضات کو پوری طرح بیان کیا جاتے اور نہ ہی ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم صرف چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

> "قرآن مجید میں جنّات کا جو تذکرہ موجود ہے وہ ایرانی، یہودی اور مقامی توہمات کا ملغوبہ ہے۔ یہ تصورات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ذہن کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ انہوں نے جو کچھ یہودیوں، عیسائیوں، اور دوسرے ذرائع سے سنا اس میں اپنے ذاتی عقائد کو داخل کر کے اُسے وحی کا نام دے دیا۔
>
> (القرآن مترجم پامر ص۵۲)

قرآن مجید میں جنت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کے ایک ایک جزو پر ان مستشرقین نے اعتراض کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کا خدا نعوذ باللہ "بڑا ہوس کار ہے"۔ اور اُس نے

اپنے چاہنے والوں کو اُن کے اچھے اعمال کی آخرت میں جزا دینے کا جو وعدہ کیا ہے اُس میں نفس کی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلہ میں اسی پامر کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"مسلمانوں کے تصورِ بہشت کے حسی پہلو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین کے رہنے والوں کے خوابوں کی تعبیر کے علاوہ کچھ ہی زائد ہے۔ (ص ۷)

اسی ضمن میں مندرجۂ ذیل استدلال بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"خدا کی دوسری صفت یعنی اُس کی جباریت پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک خدا انسانوں کا اور اس کائنات کا خالق ہے ایک مسلمان کی نظر میں خدا کی جباریت اس کے رحم اور محبت پر غالب ہے۔ اور یہ بات قابلِ فہم بھی ہے کہ ایک عرب جس قسم کے حوصلہ شکن اور کٹھن حالات میں رہتا ہے اُس میں لازمی طور پر خدا کی محبت کے مقابلے میں اُس کی جباریت ہی میں وہ زیادہ کشش محسوس کرے گا۔ (اسلام اور عرب روم لانڈو ص ۳۰)

ان اقتباسات کو جن کی حیثیت مشتے از خروارے کی سی ہے، ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کیا یہ اعتراضات اپنے اندر اتنا وزن رکھتے ہیں کہ ہم ان پر غور بھی کریں؟ اگر ان کے خوف سے تغیر و تبدل کا ایک مرتبہ سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر نہ صرف روایات کے دفاتر نظرِ ثانی کے محتاج ہوں گے بلکہ کلامِ پاک میں بھی ہمہ گیر تبدیلی ناگزیر ہو گی۔ ہمیں مغربی ذوق کی رعایت سے نہ صرف قرآن مجید میں حشر، نشر، جنت، دوزخ، اور فرشتوں کا ذکر خارج کرنا ہوگا بلکہ خود صفاتِ الٰہی میں بھی نمایاں تبدیلیاں کرنا ہونگی۔

* اگر نظر کا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں ہوا کرتا کہ چیزوں کو محض نظر کی کجی کے لحاظ سے

توڑ پھوڑ کر ٹیڑھا کر دیا جائے تاکہ وہ کسی طرح اُسے صحیح دکھائی دینے لگیں۔ اس قسم کی پائداری نہ تو دنیا میں ممکن ہے اور نہ ہی صحیح۔ اگر کسی شخص کو ایسے انسان سے فی الواقع ہمدردی ہے تو اس کی مدد کی بہترین صورت یہ ہے کہ کسی طرح اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو درست کیا جائے۔ اس کی نگاہوں کے ہدف کو اُس کی ٹیڑھ کے مطابق تبدیل کرتے رہنا ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس کی تائید عقل نہیں کر سکتی۔ اور خصوصاً جب اس ٹیڑھ کو مخصوص مصالح کے تحت جان بوجھ کر پیدا کر لیا جائے تو پھر یہ ایک ایسا مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں بجز اس کے اللہ تعالیٰ خود رحم فرما کر دل کی کجی کو دور فرما دے جس سے فکر و نگاہ کے زاویے خود بخود درست ہو جائیں۔

مستشرقین ہزاروں سالوں سے جس مذہب سے آشنا چلے آرہے ہیں وہ مسیحیت ہے۔ اس مذہب کی رُو سے ازدواجی تعلق بذاتِ خود ایک گناہ ہے۔ اس لیے ان کی عقل ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کر سکتی کہ روحانی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ انسان کبھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔ اُن کی نظر میں خدا کا محبوب انسان وہ ہے جو اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا اور اس کی ساری لذّتوں سے یکسر ناآشنا رہے۔

پھر اہلِ مغرب کے بعض مخصوص سیاسی مصالح نے بھی انہیں اسلام کو ہدفِ طعن بنانے پر اُبھارا۔ مسلمانوں کے ساتھ حاکم و محکوم کے تعلقات میں انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ اس قوم کو زندہ رکھنے، اسے آزادی کی جدوجہد پر آمادہ کرنے اور آگے بڑھانے والی اگر کوئی قوت ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں جب تک اسلام کی محبت موجود ہے اس وقت تک انہیں طاقت کے بل بوتے پر کسی حد تک غلام تو رکھا جا سکتا ہے مگر انہیں غلامی پر راضی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگر انہیں فی الواقع غلامی پر قانع اور مغرب کا تابع مہمل بنانا ہے اور ان کے اندر سے زندگی کی حرارت اور ولولے کو ختم کرنا ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ان کے قلب و دماغ میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے متعلق مختلف نوعیت کے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے جائیں اس کی آسان صورت یہی ہے کہ اُن کی فکر و نگاہ کے زاویے بدل دیئے جائیں کیونکہ ان کے تبدیل ہو جانے کے بعد پھر انہیں اسلام کی صحیح صورت بھی ٹیڑھی نظر آنے لگے گی اور اس طرح اُن کا اس دین پر سے خود ہی اعتماد اٹھ جائیگا۔